آزاد عورت: ایک تنقیدی جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یوروپی اور اِطالوی نِشاۃِ ثانیہ کے بعد سے ہی کثیر سکالرز، اصحابِ قلم اور مفکرین نے عورت اور اُس کی آزادی کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اپنے اپنے طور پر مختلف حلقوں سے وابسطہ لوگوں نے مختلف زاویوں سے آزاد عورت کی تعریف بیان کی ہے، کسی کی نظر میں اِقتصادی آزادی اور مَعاشی خود کفیلی ہی ایک آزاد عورت کی علامت ہے، تو کہیں جِنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے مکمل آزادی ہونا ایک ترقی یافتہ خاتون کی پہچان مانی جاتی ہے، اور بعض تو اس حد تک گئے ہیں کہ اُن کے نزدیک دراصل آزاد عورت وہی ہے جسے کسی بھی معاملے میں مرد کی معاونت کی اصلاً ضرورت ہی نہ ہو۔

خِرد کا نام جُنوں پڑ گیا جُنوں کا خِرد   جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اِن مغربی نگارشات اور خیالات کے ردِّعمل کی شکل میں مَشرق، خاص طور پر ہند و پاک سے تقریباً ہر طبقے نے خامہ فرسائی کی ہے؛ نتیجتاً "عورت اور مغرب"، "اسلامی اور مغربی ثقافتوں میں عورت"، "مغرب میں عورت کا مقام"، وغیرہ وغیرہ، ان عنوانات پر موجودہ وقت میں مختلف رسائل و جرائد، اخبارات اور بالخصوص انٹرنیت پر آپ کو اس قدر مضامین نظر آئیں گے کہ جن کا شمار دشوار ہے۔ مگر ان میں بہت کم ایسے ہیں جو کسی حد تک معتدل اور غیر جانبدار ہیں۔ میرے ناقص مطالعے کے مطابق ان تمام میں تین قسم کی تحریروں کی غالب اکثریت ہے:

۱)۔ لبرل تحریریں: ان میں زیادہ تر صرف ایک بات پر زور دیا جاتا ہے کہ مغربی نظام کو اپنا لیا جائے، اس کے فضائل و محاسن کے بیان سے اوراق و سُطور پُر نظر آتے ہیں، اور پستی و پسماندگی کا سارا ٹھیکرا مولوی حضرات کے سر پھوڑا جاتا ہے، گویا دنیا کی ترقی میں یہی لوگ مانع ہیں۔

۲)۔ جذباتی تحریریں: یہ کچھ ان لوگوں کی کاوشیں ہوتی ہیں جنھوں نے بالاستعاب تو مغربی ثقافت و معاشرے کا مطالعہ نہیں کیا، مگر ان کے بڑوں نے انہیں یہ سمجھا دیا ہوتا ہے کہ "بیٹا مغرب سے منسوب جو چیز بھی ہو سب کو برا ہی کہنا!" یعنی

حقائق و شواہد کی بجاے تمام توانائی قومی، ملی اور مذہبی جذبات بھڑکانے میں صَرف کی جاتی ہے، بلکہ ایسی تحریروں کو مغرب کے نام ایک "ملامت نامہ" کہا جاے تو بجا ہوگا۔

۳)۔ معتدل تحریریں: اس قسم کی تحریریں حالانکہ اقل القلیل ہیں مگر یہی اس موضوع پر لکھی جانے والی کامیاب تحریریں کہلانے کے لائق ہیں، جن میں معتدل راہ اور میانہ رَوِی کے ساتھ ساتھ جذباتی گفتگو سے پرہیز اور تمام دعوے قوِی دلائل اور مُستند شواہد پر مبنی ہوتے ہیں۔

ان میں پہلی اور دوسری قسم کی نگارشاتِ قلم نے مِلّت کو کتنا نُقصان پہنچایا ہے یہ چنداں بتانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یوں کہا جاے تو غلط نہ ہوگا کہ آج مَشرقی محققین کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا جانے کی ایک بڑی وجہ اسی طرح کی تحریروں کا معرضِ وجود میں آنا ہے۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں قسم کی تحریروں کے قارئین اور ان کے شائقین بھی صِرف دو ہی وجہ سے انہیں پڑھتے ہیں، یا تو مغرب کی شان میں "قصائدِ مدحیہ" سننے کے لیے یا مغرب کے نام "ملامت نامے" پڑھنے کی غرض سے۔ رہی تیسری قسم، تو اسی سے ہمیں سروکار ہے اور اسی پر عمل کرنے کی کوشش رہتی ہے، اب ہماری اس قلمی کاوش (جسے آپ ابھی ملاحظہ فرما رہے ہیں) میں کس حد تک ہم اعتدال قائم رکھنے میں کامیاب ہوے، اس کا فیصلہ تو قارئین کرام ہی کریں گے۔

مغربی سکالرز، مستشرقین اور بہت سے سیاسی اور سماجی افراد نے اسلام میں عورت کے مقام اور حقوق کو لیکر خاصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے، کئی کئی اوراق سیاہ کیے ہیں، بڑی جاں فشانی سے لکھا ہے، مگر افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اکثر و بیشتر ان کی تحریریں، کسی پیشگی منفی تاثر پر مبنی افکار کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ بجاے اس کے کی وہ کسی طرح کے جرائم کو روکنے یا عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے مثبت اقدام اٹھاتے، دیکھا یہ گیا ہے کہ مسلم معاشرے کی بدعملی کو وہ لوگ اسلام کی خامی بتا کر فوراً شریعت میں تبدیلی، مذہب کی جدید تشکیل اور ریفارمزم کے نعرے بلند کرنے لگتے ہیں، گویا کہ اصل مقصد تو یہی تھا، عورتوں کے حقوق کا تو بہانہ بنایا گیا ہے۔ بات بغیر دلیل کے نہ رہ جاے اس لیے

مطلاحظہ کریں، "دا ہسٹری آف دا قرآن" مصنفہ پروفیسر تھیڈور نولدیکے، پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ آخر پروفیسر صاحب نے پوری زندگی اِستِشراق میں صَرف مُشرق اور اسلام کو سمجھنے، سمجھانے اور دوسروں تک صحیح افکار کی ترجیح و اشاعت کے لیے کی تھی یا اسلام سے لوگوں کو بے زار اور متنفّر کرنے کی فاصد غرض سے؟ خیر، مقصد جو بھی ہو، لیکن جو زہر ایسے مصنّفین اور ان کی کتابوں نے پھیلایا ہے اس کا اثر آج تک عالمی سطح پر اِسلاموفوبیا کی شکل میں نظر آرہا ہے۔ اب چوں کہ ان لوگوں نے اسلامی معاشرے، اقتصادیات، طرز حیات، ثقافت اور تعلیمات پر ضخیم کتابیں لکھ کر ہم پر اتنا بڑا "احسان" کیا ہے، ضروری ہے کہ ہم بھی کچھ ان کے دَیار کی خامہ تلاشی کریں، اور کسی بھی طرح کے بُغض وعِناد سے پَرے ہو کر، صِرف نیک نیّتی کے ساتھ، ایک غیر جانبدار جائزہ لیں، تاکہ ہمارے فرنگی ہمسایوں کو بھی تو کچھ گھر کی خبر لگے اور جو کچھ ناعاقبت اندیش ہماری ہی صفوں میں موجود ہیں انہیں بھی ذرا دُرونِ خانہ اَسرار و رموز سے آشنائی ہو۔

دِکھادوں گا تجھے بھی جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے   تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

آزاد عورت:

آزاد عورت، اپنے لغوی پیراہن میں نہایت ہی دلکش جملہ ہے، مگر ٹھہریے! یہاں وہ آزاد مراد نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں، یہ آزاد، غلام کی ضد نہیں بلکہ یہاں آزاد بمعنی خود کفیل اور خود مختار ہے۔ یعنی وہ عورت یا ایسی عورت جسے کسی دیگر شخص، بالخصوص مرد کی بالکل ضرورت نہیں، نہ ہی نان ونفقہ کے لیے، نہ کسی معاونت کے لیے اور اب تو بڑھتی لیسبِیَن (ہم جنسی تعلقات قائم کرنے والی) آبادی کے چلتے نہ ہی جنسی خواشہات کی تکمیل کے لیے۔ یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا خود یاروں کا دعویٰ ہے:

The definition of an "independent woman" in the Urban Dictionary is "A woman who pays her own bills, buys her own things, and does not allow a man to affect her stability or self-confidence. She supports herself entirely on her own and is proud to be able to do so." [definitions.net/definition/independent+woman]

ترجمہ: ایک آزاد عورت کی تعریف شہری تناظر میں کچھ یوں ہے کہ، "وہ عورت جو خود اپنے خرچے اٹھائے، خود اپنی چیزیں خریدے، اور جو کسی مرد کو اپنی خود کفیلی اور خود اعتمادی پر اثرانداز نہ ہونے دے۔ وہ اپنے آپ کو خود ہی سہارا دے اور اس پر فخر کرے"۔

اس تعریف بلکہ اس فکر و تصوّر ہی سے مجھے سخت اختلاف ہے، جہاں ایک عورت کی آزادی کو در اصل مرد سے بے نیازی پر مبنی رکھا گیا ہے۔ اور یہ اِختلاف محض اس وجہ سے نہیں کہ یہ فکر مغرب سے نمودار ہوئی ہے بلکہ میرے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں ہے، اور اس تعریف کو اگر مدار تحقیق بنائیں تو شاید ایک عورت بھی ایسی نہ ہوگی جسے ہم آزاد کہہ سکیں۔ مشہور فلسفی ارسطو کا ایک مشہور زمانہ مقولہ ہے:

"Man is by nature a social animal"

ترجمہ: "انسان فطرت کے لہاذ سے ایک معاشی حیوان ہے"

اسی سے کچھ مماثلت رکھتی بات ہمیں تفاسیر میں ملتی ہے، مثلاً امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ (**و النہار مبصرا**) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اعلم ان الانسان مدنی بالطبع

ترجمہ: "جان لو، کہ انسان اپنی طبیعت کے لہاذ سے مدنی ہے"

جس کا مطلب کچھ یوں بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے لیے اجتماعی زندگی ناگزیر ہے، اور یہ کہ انسان اپنے تمام مصالح کلی طور پر پورا کرنے سے عاجز ہے، اور اسے اپنے کاموں کے لیے دوسروں کی ضرورت درکار ہے۔ بھلا پھر کیوں کر یہ ممکن ہے کہ کوئی بھی مرد یا زن ایک دوسرے سے بے نیازی کا دعوی کرے، اور یہ تو نظام فطرت ہے، اس میں کچھ بھی معیوب نہیں۔ انسان ایک دوسرے کا محتاج ہے اور اس احتیاج اور افتقار کا اقرار کرنا عین فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جاے تو یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس نام نہاد "آزاد عورت" کے تصور کو فروغ دینے والے کس

قدر غیر فطری بات کر رہے ہیں اور لوگ ان کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں۔ آہ! کیا آج لوگ فطرتِ انسانی سے بھی ناآشنا ہو گیے؟

پھر غور کرنے کا مقام ہے کہ ایک کامیاب عمرانی زندگی کے لیے مرد و زن کا باہم تعلق، آپسی ہم آہنگی اور ان کے مابین پیار و محبت کتنی ضروری ہے، زندگی کے کارہائے گراں میں وہ ایک دوسرے کا سہارا بن کر ہی ایک کامل اور صحت مند معاشرے کی تشکیل دے سکتے ہیں۔ خود سوچیۓ کہ ایسے ماحول میں جہاں جنسی بے رہروی عام ہوتی جا رہی ہے، ذمہ داریوں سے انسان کنارہ کشی اختیار کر رہا ہے، معاشرہ بکھرتا جا رہا ہے، طلاق کی کثرت ہے، ایسی فاصد فکر معاشرے پر کس طرح کے منفی اثرات مرتّب کرے گی؟ اور اس سے نوعِ انسانیت کا کتنا نُقصان ہوگا یہ بتانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہ اس طرح کے زہریلے افکار سے صرف خواتین متاثر ہو رہی ہیں، بلکہ عورتوں کی جانب سے اس بے رخی کے چلتے مردوں نے بھی آوارگی اختیار کر لی ہے، صرف امریکہ ہی کی بات کریں تو ایک رپورٹ کے مطابق:

"There is a father absence crisis in America. According to the U.S. Census Bureau, 19.7 million children, more than 1 in 4, live without a father in the home. Consequently, there is a father factor in nearly all social ills facing America today."

[fatherhood.org]

ترجمہ: "امریکہ میں موجودہ وقت میں والدوں کا فقدان ہے، امریکی سین سس بیورو کے مطابق انیس اشاریہ سات (19.7) ملین بچے، یعنی ہر چار میں سے ایک، بغیر باپ کے پرورش پا رہے ہیں۔ نتیجتًا امریکہ میں ہونے والے تقریبًا ہر جرم کے اسباب میں والد کا نہ ہونا بھی شامل ہوتا ہے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی سوچ و فکر کو فروغ دینے والے آخر معاشرے میں عورت کے وقار کو بڑھانا چاہتے ہیں یا وجودِ معاشرہ ہی کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟!

ع   یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی؟

ساتھ ہی ایک اور پہلو سے اگر دیکھا جاۓ تو یہ وہ افکار ہیں جنہیں بڑی بڑی عمارتوں میں اے سی کی ٹھنڈی ہواؤں سے محظوظ ہونے والے تشکیل دے کر عوام میں پھیلا دیتے ہیں اور بے چارے سیدھے سادھے لوگ اس کا

شکار ہوتے ہیں، چنانچہ ایک عجیب طرفہ تماشا ہے کہ امریکہ میں وہ لوگ جو معاشی طور پر مضبوط ہیں ان میں طلاق کے اعداد و شمار کم ہیں اور جو غریب ہیں یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان میں طلاق کی کثرت ہے، ملاحظہ ہو:

Women with a high school degree or less, on the other hand, face a meager 40% probability of their marriages surviving the same period.

[*Quartz,This subset of women has the best odds of making a marriage last*]

ترجمہ: "دوسری طرف وہ خواتین جن کے پاس فقط ہائی سکول کی ڈگری یا اس سے کم ہے، ان کی شادیاں اسی مدت تک (یعنی بیس سال تک) باقی رہنے کا امکان محض چالیس فیصد ہے۔"

آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح معاشرے میں ایک بحران برپا ہے۔ بچے بنا باپ کے پل رہے ہیں، عورتوں کو کثرت سے طلاق دی جا رہی ہے اور ایک سالم معاشرے کا ستونِ اوّل یعنی مرد و زن کا باہمی تعلق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر یوں ہی یہ روش قائم رہی تو وہ دن بھی دور نہیں جب لوگ اپنے بچوں کو بتایا کریں گے کہ ایک زمانے میں کبھی معاشرہ نام کی بھی کوئی چیز ہوتی تھی۔

مقامِ اصلاح میں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا اور بہت ہی ذمہ داری کے ساتھ کہ اگر اب بھی مغرب یا اس کے ہم خیال ممالک کو اپنے بکھرتے شیرازے کو بچانا ہے تو لازم ہے کہ وہ آدمی کے بنائے قوانین کو ترک کر اب خدائی احکامات کی پاس داری میں لگ جائیں، اسلام ایک مکمل دستور حیات اور نظام عمل ہے جہاں مرد و زن دونوں کے حقوق محفوظ ہیں، اسے اپنا کر آج بھی کسی برے سے برے معاشرے کو امن و امان کا گہوارا بنایا جا سکتا ہے۔ اللہ ہم سب کو اسی دین متین پر استقامت عطا فرمائے اور علم و عمل کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ آمین